

## سیرت نبوی کے مطالعے کی اہمیت اور اس کی نگارش کا طریقہ و منہاج

سیرت نبوی کے مطالعے کی اہمیت کے بیان میں اس سے زیادہ اور کسی بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اس میں انسانی افراد اور جماعتوں کے لیے وہ کامل اور سدا بہار نمونہ ہے جس کو اسی لیے تیار کیا گیا تھا کہ فرزند ان آدم ہر حال میں اس سے اپنے لیے رہنمائی اور ہدایت کی روشنی حاصل کریں، خاص طور پر اہل ایمان کے لیے اس کا ہر پہلو لائق اقتداء اور واجب اتباع ہے۔

اللہ کی قدرت اور نبوت محمدی کا اعجاز دیکھنے کے محمد رسول اللہ کی نبوت کے ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں ذات نبوی علی صاحبہا السلام پر ان سارے حالات و کیفیات کا گذر ہو گیا جن سے قیامت تک کسی انسان کا سامنا ہو سکتا ہے: فتح و شکست، غربت و امیری، شاہی و گدائی، خوشی و مسرت، غم و اندوہ، اقبال و ادبار، عزت و بے عزتی، غلبہ و مغلوبیت، سفر و حضر، تجارت و مزدوری، شادی و غمی..... غرض وہ کون سی حالت ہے جو آپ پر نہ آئی ہو اور اس سلسلے میں آپ کا سنہرا نمونہ نہ ملتا ہو۔ آپ باپ بھی بنے شوہر بھی بنے، آپ نے رشتہ داریاں بھی کیں، تعلقات قائم کئے اور مجبوراً توڑے بھی، آپ نے معاہدے کیے، آپ کو دھوکہ بھی دیا گیا اور آپ کے اوپر چھوٹے الزام بھی لگائے گئے، آپ کو نفاق کے موذی مرض کا سامنا کرنا پڑا اور آپ کو ایسے وفادار دوست بھی ملے جنہوں نے مہر و وفا کے بے نظیر نقوش صفحہ تاریخ پر ثبت کیے..... ایک عاشق رسول نے اس جامعیت کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

”عجب دربار!! سلاطین کہتے ہیں: شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلا دتھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔ مولوی کہتے ہیں: مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ، افتاء تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔ صوفی کہتے ہیں: خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، شغل تھا..... (چلے) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا،

☆ ایڈیٹر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ۔ بھارت

فائدہ تھا، زبرد تھا، قناعت تھی،..... مگر سچ یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، کیوں کہ وہ سب کے لیے آیا تھا، آئندہ جس کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا اسی کی روشنی میں چلنا تھا۔“ (النبی الخاتم ص: ۱۰۱)

## نبوت: انسانیت کی بنیادی ضرورت

سیرت رسول کے مطالعے اور اس کی نگارش کا سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کے ہر فقرے اور ہر مرحلے پر یہ بات ظاہر ہو کہ یہ ایک نبی ہادی ﷺ کی سیرت ہے، اس مطالعے میں ہر وقت یہ شعور تازہ رہنا چاہئے کہ انسانیت کو نبوت کی کتنی اور کیوں ضرورت ہے؟۔

انسان کے پاس جو حواس ہیں اور علم کے جو ذرائع ہیں وہ اس کو یہ نہیں بتلا سکتے کہ اس کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کا اپنی مخلوق سے کس قسم کا رشتہ ہے؟ انسان کا اس کائنات میں کیا مقام ہے؟ اس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اس عالم زندگی کا کیا انجام ہے؟..... اللہ کا نبی اللہ کی طرف سے براہ راست ان سارے سوالوں کے جواب لے کر آتا ہے..... انسانوں کو اندر رفتہ و فساد کی جو فطری خرابیاں رکھی گئی ہیں، اور جو انسانی زندگی کو لگا تار مبتلائے آزمائش رکھتی ہیں، اخلاق کو تباہ کرتی، آبادیوں کو اجاڑتی، تمدنوں کے فساد کا باعث ہوتی اور نفرت و ہوس کی آگ بھڑکاتی ہیں، ان خرابیوں کی اصلاح کا صحیح اور کامیاب طریقہ اس علم و یقین کے ذریعہ ہے اور اس نسخے سے ہی ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔

سیرت کے مطالعے اور اس کی نگارش کے وقت نبوت اور کار نبوت کی اہمیت اور انسانیت کی اس کے سامنے محتاجی کا اعلان ہونا چاہئے، سیرت کو اس طور پر دیکھا جائے اور پیش کیا جائے کہ وہ اس عالم گیر فساد کا تریاق ہے جس نے انسان کو خدا کی رحمت سے دور اور گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکا رکھا ہے۔ یہ بھی پیش نظر آتا رہے کہ کس طرح سارے علم و ہنر کی ترقیوں اور وسائل کی بہتات کے باوجود معاصر دنیا کی عقلیں عالمی جاہلیتِ عظمیٰ کے علاج، اور اس کے فساد کے انسداد میں ناکام ثابت ہو رہی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ اس پر متفکر نہیں، مگر اس کے باوجود جاہلیت کی یلغار کے سامنے ایک ایک کر کے مورچے ہار رہی ہیں، اور ایک ایک کر کے ظلم و فساد کو اخلاقی جواز عطا کرتی جا رہی ہیں۔

## اصلاح کی شاہ کلید

سیرت نبوی کا ایک اہم باب یہ بھی ہونا چاہئے کہ انسانی بگاڑ کے علاج کی وہ کون سی شاہ کلید تھی جو رسول اکرم ﷺ نے استعمال؟ جس سے سارے عقوے کھلتے چلے گئے۔

انبیاء علیہم السلام انسان کے علم و ارادے کو شر سے موڑ کر خیر کی طرف لگاتے ہیں۔ وہ اس میں بھلائی کی محبت اور طلب پیدا کرتے ہیں۔ اپنی جماعت کے اندر وہ یہ احساس پیدا کر دیتے ہیں کہ دنیا میں بھلائی اور نیکی کو فروغ دینا ان کا

فرض منہی ہے۔ انسان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں ہیں، مگر ہوس و طمع اور شیطان ان کو صرف ظلم و شر اور نفسانیت کی طرف لے کر چلتے ہیں، یہ انبیاء کا کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے اندر خدا طلبی کا وہ ذوق پیدا کرتے ہیں کہ ان کے لیے بھلائی کے راستے کی مشکلات آسان ہی نہیں لذیذ ہو جاتی ہیں، سیرت نبوی کا یہ عظیم ترین کارنامہ ہے اس کے بغیر ہم کسی بھی مطالعے کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔

## نبی کا پیغام و دعوت

سیرت نبوی کو محض روایتی تاریخی پس منظر میں دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو واقعات و حوادث کا بیان سمجھ لیا جاتا ہے، جس میں خوش عقیدگی کے روغن کا اضافہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں بقول بعض معاصر علماء کے وہ واقعات کی کھٹونی بن کر رہ گئی ہے، حالانکہ نبی کی سیرت کی اصل اہمیت اس کی ہدایت و رہنمائی اور اس پیغام کی وجہ سے ہوتی ہے، جس کے لیے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے، اسی کو وہ اپنی زندگی کا مشن بلکہ اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، اسی کا فروغ اس کا مقصد زندگی ہوتا ہے، سیرت کے مطالعے کے وقت فوکس اور توجہ اگر اس مشن اور پیغام سے ہٹی اور وہ کہیں پس منظر میں چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ تاریخ کی ورق گردانی بن کر رہ جائے گا، محمد رسول اللہ کے سیرت نگار کو حیات طیبہ کو اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ اس کا سب سے نمایاں اور اہم عنصر ”رسالت و نبوت“ اور اس کی دعوت و پیغام کے تمام پہلو بھی اپنی عظمت و رعنائی اور معجزانہ شان کے ساتھ سامنے آجائیں۔

## اسوۂ حسنہ

رسول اکرمؐ بحیثیت رسول، اللہ کے دین اور اس کے پیغام کے مبلغ بھی ہیں، اور انسانوں کے لیے کامل اور حسین ترین نمونہ بھی، آپ کی ذات اپنے اخلاق و صفات، مزاج و کردار، عادات و معاملات، تمناؤں اور جذبات ہر چیز میں عملی نمونہ ہے، آپ کی شب روز کی زندگی کے بغیر اور آپ کے اعمال و اخلاق کے بغیر بحیثیت رسول آپ کی سیرت نامکمل ہی رہے گی۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ ہماری روایتی سیرت نگاری میں آپ کے خلقی اوصاف کے بیان پر جو توجہ ہوتی ہے آپ کے اسوہ کے بیان پر اس سے بہت کم توجہ ہوتی ہے، دوسری طرف صحابہ کرامؓ کی حقیقت بینی اور بلندی ذوق ملاحظہ ہو کہ روایات کے ذخیرہ میں آپ کے دین اور پیغام اور اسوۂ حسنہ پر بلا مبالغہ ہزار ہا ہزار روایات ہیں اور آپ کی خلقی کیفیت پر روایات گنتی کی چند..... سیرت نگاری نے اخیر زمانوں میں کافی ترقی کی ہے، اور اب اسوۂ حسنہ سیرت کا ایک اہم جز بنتا جا رہا ہے، مگر اس کو ابھی مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

## نبوی مزاج کی خصوصیات

انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے جو دین لے کر آتے ہیں وہ محض خشک الفاظ کے سانچوں میں ڈھلا ہوا نہیں آتا، ایسا نہیں ہوتا کہ ان کو صرف واجبات و فرائض اور امر و نہی کی ایک فہرست دے دی جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو کتاب و شریعت کے الفاظ کے ساتھ اس کی روح و مزاج کی کیفیات و احساسات، اور جذبات کی آئینہ دار زندگی کے ساتھ بھیجتے ہیں، یہ زندگی خود ان انبیاء کی ہوتی ہے، جو اس دین و شریعت کی اتنی صاف اور مفصل تشریح کرتی ہے کہ ان کا ہر پہلو اس کے آئینے میں بجلی ہو جاتا ہے۔

سیدنا محمد رسول اللہ کی زندگی نبوی مزاج کا آئینہ اور ان جذبات و کیفیات کا مجموعہ ہے جو براہ راست نبوت کا خاص مقصود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آخری دین کے اوامر و نواہی کو بحفاظت ہم تک پہنچایا ہے اسی طرح اس نے ان کیفیات کو بھی ہم تک بحفاظت پہنچایا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ان کیفیات کا رنگ اس طرح چھایا ہوا تھا، کہ اگر سیرت نگار نے یا سیرت کا مطالعہ کرنے والے نے اس رنگ کو چھوڑ دیا تو سیرت کے صحیح خدو خال اور اس کی اسپرٹ اور روح سامنے نہیں آسکتے اور نہ مطالعہ سیرت کا اصل مقصود پورا ہو سکتا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کیفیات کے حلی عینا وین ہیں: خدا طلی و تعلق مع اللہ، اللہ سے محبت اور اس کا خوف، اس پر توکل یقین، عشق و سراقندگی، خدا مستی و بے خودی، عبودیت و تدلل، آخرت کا استحضار و یقین، زہد و استغنا، مخلوق خدا پر شفقت و رحمت، دلبری و دردمندی، دین پر عزیمت و استقامت، اسکی راہ میں جدوجہد و جان بازی.....

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ذات نبوی کی یہ ربانی کیفیات سیرت نگاری کی بہت سی کوششوں میں واضح طور پر نظر نہیں آتیں۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے رسول اللہ کی سیرت کسی دوسری قومی مصلح و قائد کی سیرت سے زیادہ مختلف نہیں رہتی، وہ اس سے متاثر ہو سکتا ہے، عقیدت کا اظہار بھی کر سکتا ہے، مگر اس کے دل میں وہ ایمان پیدا نہیں ہو سکتا جو مطالعہ سیرت کا گوہر مقصود ہے۔

## تعبیرات و اصطلاحات کی نزاکتیں

انسانی عقل و خرد اپنے ماحول اور تجربات کی روشنی میں پیغام رسانی کے لیے نئی نئی تعبیرات و اصطلاحات اختیار کرتی ہیں۔ یہ اصطلاحات جس ماحول میں پیدا ہوتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں اپنے ساتھ وہ انکے اثرات جو رکھتی ہیں۔ کسی طرح وہ اپنے پس منظر سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے زمانوں میں اور ان سے پہلے دنیا میں مختلف اصلاحی اور فکری تحریکیں قائم ہو چکی تھیں، الگ الگ قسم کے اخلاقی اور الہیاتی فلسفے تھے، جنہوں نے اپنے اپنے زمانوں میں سہلہ جمایا تھا، مگر قرآن مجید کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اپنے دین کے حقائق کی تشریح اور اپنی

دعوت کے لیے ان اصطلاحات اور تعبیرات کو مستعار لینا اور ان سے کام چلانا کبھی گوارہ نہیں کیا۔ اس کے بجائے ان کو اپنی پیغام رسانی کے لیے نہایت سادہ اور حقائق پر مبنی الگ اصطلاحات اور منفرد تعبیرات اللہ کی طرف سے دی گئی تھیں۔ آں حضرتؑ سے پہلے تخریف شدہ یہودیت و نصرانیت کے علاوہ حکمت و فلسفہ یونان و ہند اور فارس و مصر و روم پر چھائے ہوئے تھے، ہر ذہن آدمی ان سے متاثر ضرور تھا۔ مگر نبوت محمدی نے انسانی زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو کھولنے اور انسان کے لیے صحیح اور متوازن طرز زندگی کی تشریح میں ایمان، احسان، تزکیہ، عبادت، تقویٰ، خشیت، آخرت، رسالت، نبوت، وحی، علم، عدل، انصاف، مواسات و ہمدردی اور اخلاق جیسی اصطلاحات استعمال کیں۔

رسول اللہؐ کی سیرت اور آپ کے پیغام کی تشریح کے لیے نہ قدیم فلسفی و اجتماعی اصطلاحات موزوں تھیں اور نہ عصر حاضر کے ازموں اور سیاسی و اجتماعی تحریکوں کی اصطلاحات۔ ماضی قریب اور معاصر لٹریچر میں سیرت نبوی کے سلسلے میں جمہوریت، اشتراکیت اور سوشلزم وغیرہ کی اصطلاحات بعض لوگوں نے فراخ دلی کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ ہر کچھ دنوں کے بعد کوئی نیا ازم، یا فلسفہ دنیا پر فیشن کی طرح چھا جاتا ہے، پھر جب وہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے انتشار و عدم توازن اور انفرادی و اجتماعی مسائل کو مزید بڑھا کر رخصت ہوتا ہے تو کوئی نیا ازم دنیا پر مسلط کر دیا جاتا ہے، اور اس کا بسا پر و پیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ دنیا کے سارے مسائل کا حل اسی میں نظر آنے لگتا ہے۔ اس فضا سے ہم بھی متاثر ہو جاتے ہیں، کسی کو رسول اللہؐ کی دعوت میں جمہوریت کی صدا سنائی دینے لگتی ہے، تو کوئی اسکو ایک موزوں اشتراکی تحریک کہنے لگتا ہے، کوئی سوشلسٹ اصطلاحات میں رسول اللہؐ کی اقتصادی اصلاحات بیان کرتا ہے، تو کوئی آں حضرتؑ کے پیغام کو اشراقیہ کے اقتدار اور ملکیت کے خلاف قومی بغاوت کا نام دیتا ہے، یہاں تک کہ بعض مستند علماء بھی جو سیرت کا اس کے اصل تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں آں حضرتؐ کو جمہوری لیڈر اور آپ کی اصلاحات کو جمہوری یا سوشلسٹ اصلاحات کہہ جاتے ہیں۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ ان تعبیرات کا پیر بہن، نبوی پیغام کے لیے قطعاً موزوں ہے، انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے دین لے کر آتے ہیں۔ ان کا کام انداز و پیشیر ہوتا ہے، ہدایت و تزکیہ ان کا طریقہ کار اور انسانوں کو اپنے خدا سے جوڑنا اور اس کی رحمتوں سے فیضیاب کرنا ان کا مشن ہوتا ہے، ان کا پیغام نہ کسی فاسد تمدن کا رد عمل ہوتا ہے، اور نہ کسی ظالم اقتصادی و سیاسی نظام کے خلاف عوامی جذبے کا اظہار، وہ صرف وحی و نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اس کے لیے یہی تعبیرات زیادہ صحیح اور موزوں ہیں۔

حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے سیرت طیبہ کے بیان اور آپ کے پیغام کی تعبیر و تشریح میں نہایت احتیاط کرنی چاہیے، اور اس کے لیے وہی اصطلاحات و تعبیرات باقی رکھنی چاہیں جو خود آپ نے اپنی احادیث میں اور آپ کو سب سے زیادہ جاننے اور سمجھے والے صحابہ کرام نے استعمال کی ہیں، نیز سیرت طیبہ کے بیان کا جو عمومی رنگ اور

فضا ہو وہ اسی رنگ اور فضا سے بالکل ہم آہنگ ہونی چاہیے جس کا قرآن اور حدیث رسول کا گہرا مطالعہ کرنے والا مشاہدہ کرتا ہے۔

## قدیم سرمایہ سیرت پر ایک نظر

جامع اور متوازن سیرت نگاری اور تجزیاتی مطالعے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے پاس سیرت پر جو مواد موجود ہے اس کی نوعیت پر نظر ہو، یہ بھی معلوم ہو کہ کسی عہد میں اس فن کی داغ بیل پڑی؟ وہ کس ماحول میں تیار ہوا؟ جس زمانے میں وہ پروان چڑھا اس کے رجحانات کیا تھے؟ یہ بھی تفصیل سے معلوم ہو کہ اس سرمایے کے اپنے آخذ کیا ہیں؟ ان کی استنادی حیثیت اور مرتبہ کیا ہے؟ اور اس کی جانچ پرکھ کے کیا اصول ہیں؟۔

جہاں تک سیرت کے آخذ کی درجہ بندی اور ان کے تاریخی و روایتی استناد کا تعلق ہے، یہ ایک طویل موضوع ہے۔ ہمارے ہندوستانی مؤلفین میں علامہ شبلی اور ان کے بعد کے کئی محققین نے اپنی کتب سیرت کے مقدموں میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے، بہت کم ہی ضروری مباحث ایسے ہیں جو ان کے یہاں نہیں ملتے، لہذا اس سرمایے سے متعلق کچھ متفرق ضروری باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔

۱۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اولین سیرت نگاروں نے وسیع معنی میں سیرت طیبہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اپنا مقصود نہیں بنایا تھا، ان کی توجہ کا اصل مرکز یہ چند پہلو تھے۔ (۱) رسول اکرم کی قبل بعثت زندگی خاص طور پر خاندانی پس منظر، ولادت، ورضاعت، وغیرہ۔ (۲) بعثت کے بعد کے اہم واقعات وحوادث، خاص طور پر مکی معاشرے کی سیاسی صورت حال (۳) مدنی عہد میں خاص طور پر غزوات و سرایا اور سیاسی آویزشیں، اس صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اس بات پر غور کرنا کافی ہوگا کہ فن سیرت کا نام ”علم السیرۃ“ کے بجائے ”علم المغازی“ رکھا گیا، شاید بلکہ غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات نے ان پہلوؤں کو خاص طور پر محفوظ کرنا چاہا جن کو محدثین کرام اپنے موضوع بحث سے کسی حد تک خارج سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے جمع و تدوین اور بحث و تحقیق کے دائرے میں صرف آں حضرت کے تشریحی ارشادات، احکام و قضایا، مواعظ و خطبات اور سنن و فرائض کی ادائیگی کے طریقے اور حقائق دین و ایمان سے متعلق روایات کو ہی رکھا تھا۔

ابن اسحاق دوسری صدی میں اپنی مغازی ترتیب دے چکے تھے، موسیٰ بن عقبہ بھی ان کے ہم عصر تھے، انہوں نے اس فن کی طرح جن بنیادوں پر ڈالی وہ اسی پر قائم رہا، ابن سعد اور طبری جیسے مورخین نے بھی عہد نبوی کی تاریخ کے لیے ان ہی بنیادوں کو استعمال کیا، ابن قیم کی زاد المعاد اور چند دوسری کوششوں کے استثناء کے ساتھ فن سیرت جدید دور (یعنی چودھویں صدی ہجری) سے پہلے ان خطوط پر ہی اپنا سفر طے کرتا رہا، محدثین کے حلقے نے اس پر شاکل اور دلائل

نبوت کا اضافہ بھی کیا۔

۲۔ سیرت و تاریخ اسلام کی روایات جس زمانے میں جمع و تدوین کے مرحلوں سے گذر کر کتابی اور مرتب علمی انداز میں محفوظ کی جانے لگیں، یہ وہ زمانہ ہے جب امویوں کی شمشیر خارا شکاف نے چہار دانگ عالم میں تہلکہ مچا رکھا ہے، اور غلبہ و اظہار دین کا خدائی وعدہ پورا ہو چکا ہے۔ اس فضا کا اثر تھا یا روایتی تاریخ نویسی کا قدیم انداز کہ سیرت نگاری پر ”مغازی“ کی فضا چھا گئی، اگر آپ سیرت و تاریخ کے ماخذ دیکھیں اور حدیث و سنت کے ذخیروں سے اسلام کے روحانی اصلاحی اور اخلاقی کارناموں کو جمع نہ کریں تو یہ رسول اللہ کی نہایت نامکمل سیرت ہوگی، جس میں آپ ایک تحریک کے بانی، ایک فاتح، یا ایک مصلح اور فرمانروا زیادہ نظر آئیں گے، ایک نبی و صاحب وحی اور مکمل بشری نمونہ کی تصویر کم بنے گی، آپ کو پورا عہد مدنی غزوات کے ارد گرد طواف کرتا نظر آئے گا، اور عہد کی اتنی کم تفصیلات ملیں گی کہ بے اختیار تاریخچی ماخذ کی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے کو دل چاہے گا۔

فن سیرت کے قدیم ماخذ پر ”مغازی“ کی چھائی ہوئی فضا کو اور اس عہد کے عمومی ماحول کو سامنے ضرور رکھنا چاہئے، اور کوشش کرنی چاہیے کہ اصل واقعہ اور اس ماحول کے زیر اثر کی گئی اس کی تشریح و توضیح جو راوی اور مورخ خود کرتا ہے دونوں کے درمیان فرق کیا جائے۔

۳۔ فن حدیث اور فن سیرت کی روایات کے درمیان ایک اہم فرق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے، علماء اسلام نے حدیث کو براہ راست دین کا حصہ اور وحی ربانی سمجھ کر جمع کیا، اور اس کے لیے وہی احتیاط برتی جو اس کا حق تھی۔ احتیاط کے پیش نظر ایک ایک روایت کو الگ الگ بیان کیا، ان کے درمیان تاریخی یا فنی ترتیب و تسلسل قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، بیان میں کم از کم اپنے فہم و فکر کو اثر انداز ہونے کا موقعہ دیا، جو راوی نے خود سنا وہ بیان کیا، اپنی طرف سے اسباب و علل کے بیان سے پرہیز کیا۔ پھر اس فن کے ناقدوں نے اس کو دسیوں کسوٹیوں پر پرکھا، داخلی و خارجی ذرائع استعمال کیے، اصل واقعے کے بیان میں کہیں کسی سے کوئی تسامح ہوا تو اس کو بھی پکڑا، راوی نے کہیں تشریح و توضیح کے طور پر اپنی طرف سے کوئی بات شامل کر دی تھی (جس کو محدثین کی اصطلاح میں ادراج کہتے ہیں) تو اس کو مختلف روایات کے مطالعے کے ذریعہ اس کو بھی الگ کیا..... اس کے برخلاف سیرت و تاریخ کی روایات میں ایسا نہیں ہو سکا، ابتدائی سیرت نگاروں نے تاریخی تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے الگ الگ روایات کو باہم ملایا بھی، اپنے قیاس سے اس کی تفسیر اور اسباب و محرکات بھی بیان کیے۔ ظاہر بات ہے علماء اسلام کے نزدیک تاریخی واقعات کی وہ اہمیت نہیں تھی جو ان کی شریعت اور دینی واجبات کی تھی، اس لیے اس سرمایہ کو فن حدیث کے ”صرف افوں“ نے اپنے سخت معیاروں پر جانچا بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ روایات و اخبار جو محدثین کی کتابوں میں تاریخ و سیرت سے متعلق موجود ہیں، خود محدثین نے ان کی اس طرح جانچ پرکھ نہیں کی ہے جس طرح وہ احکام شریعت کی روایات کی کیا کرتے تھے۔

ہمارے سرمایہ حدیث میں احکام کی روایات پر ناقدین حدیث نے نقد و تحقیق کے اصول زیادہ سختی سے برتے اور باریک بینی سے استعمال کیے ہیں، دیگر روایات میں انہوں نے اتنی باریک بینی سے کام نہیں لیا، اس لیے یہ بات ظاہر ہے کہ دونوں کا درجہ ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔

۴۔ مسلمانوں نے روایات حدیث و تاریخ کی تنقید کے لیے جو منفرد نظام ایجاد کیا وہ بجا طور پر ان کی علمی تاریخ کا ایک درجے بہا اور قابل صد فخر کارنامہ ہے، جس سے ممکنہ حد تک کسی تاریخی روایت کی جانچ کی جاسکتی ہے، اور اس کے قابل اعتماد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ سیرت نبوی کی روایات کی جانچ ان اصولوں پر نہیں کی جاسکتی۔ عموماً اس کی وجہ یہ خیال کی جاتی ہے کہ یہ اصول نہایت سخت ہیں، اور ان کی معقولیت و افادیت فن حدیث میں اس لیے تھی کہ اس پر عقائد و ایمانیاں اور حلال و حرام کا دار و مدار تھا، سیرت نبوی تو محض تاریخی واقعات و حوادث کے قسم کی چیز ہے، اس لیے اس کی روایات کو اتنے سخت اصولوں پر کسے کی ضرورت نہیں۔

لیکن اگر آپ غور کریں تو آپ کو صورت حال اس سے مختلف نظر آئے گی، سیرت نبوی کا تعلق براہ راست ہمارے مرکز ایمان یعنی رسول اللہ کی ذات سے ہے، سیرت ہمارے لیے گویا وہی مقام رکھتی ہے جو ابتدائے اسلام کے لوگوں کے لیے ذات نبوی کا تھا، سیرت پوری کی پوری دین ہے، اس میں کمزور روایتیں قدم قدم پر ہماری عقیدت کا امتحان لیں گی۔

ہاں! جو روایتیں خالص تاریخی نوعیت کی ہیں تو ان کو واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے اور اس عہد کی تصویر کو مکمل کرنے کے لیے ضرور استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ روایتیں اسلام کے ان اصولوں سے کسی درجہ میں بھی نہ ٹکرائیں جو قرآن اور قوی ترین روایتوں سے ثابت ہوتے ہیں، ان روایتوں کا لازمی طور پر اس معجزانہ حد تک کے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاق کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے جس کا رسول اسلام حامل تھا اور جس کی یقینی گواہی صحیح کتب حدیث کا ایک ایک صفحہ دیتا ہے۔

۵۔ شاید یہ خیال بھی زیادہ صحیح نہیں کہ کتب حدیث کے ذخیرہ میں سیرت نبوی اور عہد نبوی کے تاریخی پہلوؤں سے متعلق روایات بہت کم ہیں، واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں عہد نبوی کے تاریخی پہلوؤں سے متعلق بہت مواد ملتا ہے، اور بسا اوقات تو اس کی نوعیت بڑی اہم اور غیر معمولی ہوتی ہے، کبھی کبھی ان میں ایسے پہلو یکارڈ ہو جاتے ہیں جن کا کوئی سراغ تاریخ و سیر کی کتابیں نہیں دیتیں۔ یہ روایتیں حدیث کی تمام کتابوں میں بکھری ہوتی ہیں، ان کو جمع کرنا ایک لمبا کام ضرور ہے۔ مگر اب لوگ کرنے لگے ہیں۔ عربی اور اردو میں دو الگ محققین نے بخاری و مسلم کی ان روایات کو جمع کیا ہے جو تاریخی نقطہ نظر سے سیرت نبوی سے متعلق ہیں۔ مسند احمد کی فقہی ترتیب ”الفتح الربانی“ کی

تیرہویں اور بیسویں، اکیسویں اور بائیسویں جلد میں سیرت سے متعلق نہایت وافر سرمایہ موجود ہے۔ سیرت کے معروف ماہر اور مؤرخ ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کے زیر نگرانی متعدد محققوں نے سیرت کے الگ الگ عہدوں اور ابواب سے متعلق حدیث و تاریخ کی روایات جمع کی ہیں، اور ان کی محدثین کے اصول کے مطابق جانچ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ کام جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) کے پی ایچ ڈی اور ایم اے کے مقالات کی شکل میں تقریباً مکمل ہو چکا ہے، کچھ چیزیں طبع ہو چکی ہیں اور کچھ منتظر طبعیت ہیں۔

## عہد جاہلی

رسول اللہ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ جاہلی کہلاتا ہے، سیرت نبوی کے پس منظر کے طور پر یہ زمانہ بھی زیر بحث آتا ہے، خاص طور پر عربوں کی ماقبل اسلام تہذیب و معاشرت دل چسپی کا موضوع بننے میں..... بعثت محمدی سے پہلے عربوں کی زندگی کورے کاغذ کی طرح تھی، قبائلی زندگی جو تمدن کے نقش و نگار اور تکلفات سے پاک تھی۔ عربوں کے علاوہ دنیا کی مختلف قوموں نے تمدن و تہذیب اور مذاہب و ادیان کی وادیوں میں مختلف راہیں نکالی تھیں۔ مختلف قوموں نے فلسفہ و حکمت اور تمدن و حکومت کے پر عرب نقوش قائم کیے تھے، بہت سی منظم حکومتیں قائم تھیں، علم کی مسندیں آراستہ اور فنون کی بزمیں سجی ہوئی تھیں، مگر سب کا قبلہ غلط تھا اور شر کے رخ پر تھا، اور سب کا سب قرآن کے الفاظ میں ”برو بحر کے عالمی فساد“ کا مصداق تھا۔

عرب دنیا سے الگ اپنی صحرائی بدویانہ زندگی میں مست تھے۔ مگر یہ تصور غلط ہے کہ وہ اسلام سے پہلے محض فساد و ظلم کا مجموعہ اور خیر و نیکی سے عاری تھے، شاید رسول اللہ کے کارنامے کی عظمت بیان کرنے کی نیت سے غالباً بے شعوری طور پر اکثر یہی تصور قائم کر لیا جاتا ہے۔

عرب بے پڑھ لکھے تھے، تمدن کی رنگینیوں سے دور، اور فلسفے کی موٹے گاٹیوں سے ناواقف تھے، ان کو اپنے امی ہونے کا اور کتاب شریعت سے تہی دامن ہونے کا اعتراف تھا۔ مگر ان کی اس کمی نے ان کو فطرت سے قریب اور نفسیاتی و اخلاقی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ مشرک تھے، مگر ان کے اندر دین ابراہیمی کے باقی ماندہ اثرات تھے۔ ان میں بلا کی اخلاقی خوبیاں تھیں، سچائی اور وفاداری میں فرد، عزم و خودداری میں یکتا، اور سادگی و شہامت اور غیرت و ہمت ان کی قومی صفات تھیں۔

ان کی یہ خوبیاں ہی تھیں جن کی وجہ سے ان کا اس نبوت کے لیے انتخاب عمل میں آیا جس کی مخاطب پوری انسانی برادری تھی۔ آپ سے پہلے انبیاء اپنی اپنی قوموں میں آتے تھے، اس لیے کسی قوم میں نبی آنا عام حالات میں اس بات کی علامت نہیں ہوتا تھا کہ وہ قوم دوسری قوموں سے بہتر ہے۔ مگر آج حضرت کی بعثت عالمی تھی، اور آپ کے پیغام

کو عربوں (بنی اسماعیل) کے واسطے سے پوری انسانیت تک پہنچانا تھا، اور وہی آپ کے دین کے سارے عالم کے لیے معلم قرار پائے تھے۔ اس لیے بنی اسماعیل کا اس عظیم کام کے لیے انتخاب خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کچھ خاص امتیازی صفات کے حامل تھے۔

خود رسول اللہؐ نے اس کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے بنی اسماعیل کا اور ان میں سے بنو کنانہ کا اور ان میں سے قریش کا انتخاب فرمایا، پھر ان میں سے بنی ہاشم اور میرا انتخاب فرمایا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ نے مجھے مخلوق کی بہتر جماعت میں پیدا فرمایا، پھر اس جماعت کے بہتر قبیلے میں مجھے رکھا..... (سنن ترمذی باب فضل النبیؐ)۔

ایک معاصر سیرت نگار کو عربوں کی ان خوبیوں کو ان کی جاہلی تاریخ و ادب کے خزانوں سے نکال کر لانا چاہیے، اور اس بات کا ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ کیوں عرب اس امانت کے لیے زیادہ موزوں تھے۔

### زمانہ قبل بعثت

رسول اکرمؐ کی ولادت اور رضاعت کے زمانے کے بہت سے محیر العقول واقعات سیرت کی کتابوں میں روایت کیے جاتے ہیں، اگر یہ قابل اعتماد ذرائع سے اور صحیح روایات سے ثابت ہوں تو بسرو چشم قبول کیے جائیں۔ مگر ان کی بہت بڑی اکثریت بلکہ سوائے چند کے تمام نہایت کمزور اور بے اصل قسم کی روایتیں ہیں۔ بہت سے لوگ یہ کہہ کر ان کو قبول کر لیتے ہیں کہ فضائل و معجزات کے باب میں ضعیف روایتیں قبول کر لی جاتی ہیں۔ مگر یہ کم علم محسوس کرتا ہے کہ ان روایتوں کی حیثیت محض ”ضعیف“ روایات کی نہیں ہے، بلکہ اکثر روایتیں نہایت کمزور اور ”واہی“ قسم کی ہیں، اور محدثین کے جس اصول کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ اتنی کمزور روایات یا ”واہی و موضوع“ روایات کے لیے نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث کی عام معتبر کتابوں میں یہ روایات نہیں لی گئی ہیں۔ بلکہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان روایات کا اکثر حصہ ایسا ہے کہ اس کو اگر کوئی متقدمین کے عہد میں یہ کہہ کر روایت کرنے لگتا کہ میں تو سند بیان کر رہا ہوں لوگ راویوں کو جان کر خود ان کے بارے میں فیصلہ کر لیں گے، تو محدثین اس کو ہی ساقط الاعتبار یا کمزور قرار دے دیتے۔ اسی لیے حدیث کی عام کتابوں میں ان روایتوں سے احتیاط برتی گئی ہے۔

بعض معاصر اور ماضی قریب کے علماء نے یہ بات کہی ہے کہ حضور اکرمؐ کی ولادت کے اور بچپن کے حالات و معجزات اس لیے صحیح روایات میں ریکارڈ نہیں ہو سکے، کہ مسلمانوں کی علمی بزم تو عہد مدنی کے آخری نصف میں آراستہ ہوئی شروع ہوئی، ماقبل ولادت اور بچپن کے معجزات کو دیکھنے والے اس دور میں بہت کم بچے تھے، یہ بات تو حقیقت سے قریب تر ہے، مگر اسی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر صحابہ کرام نے ان واقعات کو بیان کیا ہے (چاہے انہوں نے

ان معجزات و واقعات کو خود دیکھا ہو، یا کسی اور سے سنا ہو) بہر حال اگر صحابہ نے ان کو روایت کیا ہے تو یہ صرف نہایت کمزور راویوں کے یہاں کیوں ملتے ہیں، معتبر راوی ان کو روایت کیوں نہیں کرتے؟؟ اور اگر صحابہ کرام نے ان کو روایت کیا ہی نہیں ہے تو یہ کمزور راویوں کے پاس کہاں سے پہنچے؟۔

ایک اہم اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ محیر العقول واقعات دینی اعتبار سے سیرت رسول کا ایک مفید و ضروری عنصر ہوتے تو اللہ کی تقدیر میں یہ ضروری ہوتا کہ یہ قابل اعتماد ذریعے سے ہم تک پہنچتے، اس لیے کہ نبی آخر الزماں کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ جس کا تعلق آپ کی نبوت و رسالت سے ہو اور جس سے سیرت کے نبوی پہلو کو تقویت ملتی ہو وہ مکمل طور پر بے اصل روایات میں ہی پایا جائے، ایسا بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال! کمزور راویوں میں پائے جانے والے محیر العقول واقعات کے بکثرت بیان سے سیرت طیبہ پر ایک دیومالائی رنگ چھانے لگتا ہے، جو دین اور اس کی دعوت کے لیے مضر ہے۔ ہاں ماقبل ولادت اور بچپن اور جوانی کے جو معجزات اور آیات و دلائل معتبر راویوں اور قابل اعتماد ذرائع سے آئے ہیں ان کا بیان ضروری ہے۔

آں حضرت نے بعثت سے پہلے ایک نہایت اعلیٰ کردار کی شریفانہ زندگی گزاری تھی، کئی معاشرے میں آپ کا کردار و اخلاق مسلم تھا، قرآن نے بھی مخالفین کو آپ کی بعثت سے پہلی زندگی کے حوالے سے غور و فکر کی دعوت دی تھی۔ ہمارے سیرت و حدیث کے سرمایے میں ایسی روایات موجود ہیں جو آپ کی امانت سچائی، راست بازی، عدل، ہمدردی و غم خواری، مکہ میں آپ کی معتبر شخصیت اور اعلیٰ درجہ کی روحانیت و خدا پرستی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ یہ روایتیں سیرت نگار کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

## مکی عہد

جس طرح کسی بارعب و پر شکوہ و شوکت قلعے کی مضبوطی کا دار و مدار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے، جو زمین میں چھپی ہوتی ہے، اسی طرح اسلام کے عظیم الشان قلعہ کا جو مرعوب کن منظر عہد مدنی میں نظر آتا ہے، اس کی مضبوطی کا راز عہد کی میں چھپا ہوا ہے۔ سطحیت کے ساتھ کیا گیا مطالعہ ان عظمتوں کا راز جنین و تبوک کے میدانوں اور طائف و اوطاس کی وادیوں میں دکھائے گا مگر نگاہ حقیقت بین اور تحلیل و تجزیہ کے ساتھ کیا گیا مطالعہ اس کی جڑیں مکی عہد کی پرسوز دعوت، حکیمانہ تربیت، مؤمنانہ صبر و استقلال، اور مدبرانہ حکمت عملی میں ڈھونڈیں گے۔

مدنی عہد کی طرح مکی عہد کا اتنا مفصل ریکارڈ ہمارے حدیث و سیرت کی دفتروں میں نہیں ہے، اس کے تاریخی اور سماجی اسباب بھی تھے، اس لیے یہاں ہم کو زیادہ گہرے تجزیے اور استنباط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے اس عہد کی اہمیت اس اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے کہ یہ دور سیرت نبوی کے اس وقت کا شاہد ہے جب مسلمان کمزور اور

مغلوب تھے اور ایک غیر مسلم اقتدار کے تحت رہتے تھے، دعوتِ اسلامی کے راستے میں رکاوٹیں سخت اور بے شمار تھیں۔ پھر چند سالوں کے بعد ہی مدینہ کے افق سے اسلام کے غلبہ کا سورج طلوع ہوتا ہے، صدیوں تک اس کو زوال نہیں ہوتا، اسی روشن اور پُر بہار دن میں فکرِ اسلامی پروان چڑھتا ہے، مسلمان اپنے انفرادی اور اجتماعی رویے طے کرتے ہیں، اپنی شریعت و قانون کے ضابطے متعین کرتے ہیں، ان کا پورا ذہنی سانچہ اسی غلبہ و عافیت کے دور میں تیار ہوتا ہے۔ تا آنکہ ۱۲ صدیوں بعد یہ سورج غروب ہوتا ہے، اور اسی اندھیرے کی رات شروع ہوتی ہے جس میں رسول اللہ نے اپنے سفرِ کاکہ سے آغاز کیا تھا۔

اب ایک مرتبہ پھر امت کو اسی طرح کی حکمتِ علمی اور دعوتی تدریج کا راستہ ڈھونڈنا ہے جس پر رسول اللہ نے مکی عہد میں اور مدینہ کے ابتدائی عہد میں سفر کیا تھا، جس میں اصولوں پر عزیمت کے ساتھ جمنے کا بھی سبق ہے، کفر و ایمان کی واضح حد بندی بھی ہے، اور بھرپور حکمتِ عملی کے ساتھ مخالف ماحول میں اپنے لیے گنجائش پیدا کرنے اور رکاوٹوں کے بیچ سے راستہ نکالنے کی تدبیریں بھی۔

ایک طرف تو آپ کفر سے اسی طرح براءت کا اظہار کرتے ہیں جس طرح سورہ ”الکافرون“ میں آپ کو حکم دیا گیا تھا، دوسری طرف آپ بنو ہاشم سے خاص طور پر اور بنو عبدمناف کے خاندان سے عمومی طور پر نہیں اور کمزور مسلمانوں کی حفاظت میں مدد بھی لے رہے ہیں۔ مکہ کی قبائلی زندگی میں جو رسم و رواج اور عرف ہیں آپ اس کو بھی استعمال کر رہے ہیں۔ مدینہ میں مشرک عناصر و رہو دی قبائل پر مشتمل ایک مشترک دستوری مملکت بھی تشکیل دے رہے ہیں جو قریشی خطرے کا مقابلہ متحد ہو کر کرے گی..... مکی زندگی میں آپ کو چک اور صلابت کے حدود بھی ملیں گے اور عزیمت و رخصت کے اصول بھی، اور ان کے علاوہ ایسے بہت سے رہنما اصول ملتے چلے جائیں گے جو عہدِ حاضر میں ہمارے طرزِ عمل کی شرعی بنیاد ہوں گے۔

عہدِ مکی کے مطالعے میں اس دور کی دعوت کے عناصر کی تلاش ایک اہم موضوعِ بحث ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں بہت اہم مواد موجود ہے، جو اس پوری فضا کی نہایت مکمل اور مفصل تصویر کشی کرتا ہے جس میں اسلامی دعوت اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ قرآن مجید اس دور کی دعوت کے بنیادی عناصر بھی بیان کرتا ہے، اس وقت اس کے کیا دلائل دیے جا رہے تھے؟ کس قسم کے اعتراضات اور شبہات پیش آ رہے تھے؟ اس کو بھی واضح کرتا ہے، نیز اس کے بیانات کے بین السطور اور سلوٹوں میں یہ بھی پڑھا جاسکتا ہے کہ اس مخالفت بھری فضا کے کیا نفسیاتی اثرات اہل ایمان پر پڑتے تھے۔

عہدِ مکی کے مطالعے کے دوران رسول اللہ کے حکیمانہ طرزِ عمل کا گہرا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے، جس میں یہ پتہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ آپ اس کثیر رنجی مخالفت کا سامنا کس طرح کر رہے تھے؟ کن شخصیتوں اور جماعتوں کو

اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ڈھال بنا دیا تھا؟ آپ کا ان شخصیتوں اور جماعتوں سے کس قسم کا رابطہ رہتا تھا؟۔

عہدگی کا ایک اہم باب ہجرت حبشہ ہے، ہجرت حبشہ کے دعوتی اور سیاسی پہلوؤں کو خاص طور پر اہمیت دینی چاہیے، یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ جنوبی اور مشرقی عرب کے قبائل فارسی حکومت کی سیاسی سرپرستی کے تحت تھے، اہل مکہ (اور اہل مدینہ) کے بھی کسری کے دربار سے تعلقات تھے، خود کسری بھی ان علاقوں کے لوگوں کو اپنا محکوم جانتا تھا، اسی لیے جب اس کے پاس رسول اللہ کا خط پہنچا تو اس نے آمرانہ تکبر سے کہا: ”یکتب الیٰ ہذا و هو عبدی“ (میرا غلام ہو کر مجھ سے اس طرح خطاب؟) اور اسی لیے اس نے اپنے یمن کے گورنر کو لکھا کہ وہ مدینہ دو آدمی (صرف دو) بھیج کر آنحضرتؐ کو گرفتار کروا کر مدائن بھیج دے..... اس پس منظر میں دیکھیے کہ رسول اللہؐ نے صحابہ کرام کو حبشہ کی حکومت کے پاس بھیجا جو ایران کی ساسانی حکومت کی عالمی حریف سلطنت روم کے تابع اور اس کی ہم مذہب (عیسائی) تھی۔

حبشہ میں مسلمان ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت رہنے لگے، جوان کو ان کی ذاتی زندگی میں مذہبی آزادی بھی دیتی تھی، اور ان کی حفاظت بھی کرتی تھی، صحابہ کرام نے بھی اس حکومت سے وفاداری اور خیر خواہی کا ثبوت اس حد تک دیا کہ اس کے لیے اپنی فوجی خدمات تک پیش کیں..... حبشہ میں مسلمانوں کا رویہ اور طرز عمل ہمارے سامنے حکمت عملی کے اہم دروازے کھولتا ہے، اسی طرح حضرت جعفرؓ کی نجاشی کے دربار میں کی گئی تقریر اسلامی دعوت و سیاست کا ایک شاہکار ہے۔

اہل علم و فکر کے لیے ایک سوال یہ بھی غور طلب ہے کہ وہ کون سی مصلحت تھی کہ جس کی خاطر مہاجرین حبشہ کو رسول اللہؐ نے امن و حفاظت اور آزادی کا وطن میسر ہونے کے بعد بھی اس وقت تک نہیں بلایا جب تک صلح حدیبیہ نہیں ہو گئی، یہ لوگ صلح حدیبیہ کے بعد جب عرب میں کوئی بڑی مخالفت نہیں رہ گئی تھی وہاں سے واپس ہوئے اور فتح خیبر کے بعد آں حضرتؐ سے ملے۔

کئی دعوت کا ایک اہم باب موسم حج اور اس کے علاوہ رسول اللہؐ کی قبائل کے وفود سے ملاقات بھی ہے، جس میں آپ ان کو اسلام کی بھی دعوت دیتے تھے اور اپنے لیے پناہ اور حفاظت کی بھی فرمائش کرتے تھے۔

اس عہد کے مطالعے کا ایک اہم موضوع یہ ہے کہ مکہ والوں کی اور عام طور پر سارے عرب کی مخالفت کے کیا اسباب تھے؟ وہ اسلام دشمنی اور اس کا راستہ روکنے کے لیے کیا کیا وسائل استعمال کرتے تھے؟ اسی طرح ایک نہایت اہم سوال جو بہت سے دلچسپ حقائق کو سامنے لائیگا، یہ ہے کہ کیا اہل مکہ اور قریش کے لیے کچھ ایسی اخلاقی رکاوٹیں یا قبائلی و خاندانی بندشیں تھیں جو عام طور پر ان کی مخالفت کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتی تھیں؟ راقم سطور کی نظر میں علامہ شبلی نعمانی وہ پہلے سیرت نگار ہیں جنہوں نے کسی حد تک یہ پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ قریش اور اہل مکہ اپنی

مخالفت اور محاذ آرائی میں ان آخری حدوں تک کیوں نہیں جاتے تھے جہاں تک جانے سے روکنے والی بظاہر کوئی مادی وجہ نہیں تھی؟ راقم سطور کی ناقص نظر میں اس کا سبب آپسی قرابت داری اور خاندانی رشتوں کا پاس اور لحاظ تھا، جو عربوں کا قومی مزاج تھا، حتیٰ کہ اگر بعض بد بخت اس مخالفت میں ان حدوں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہتے تھے تو بھی ان کو روکا جاتا تھا۔ رسول اللہ مکہ کے مخالفانہ اور خطرناک ماحول میں ایک طرف تو نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنی دعوت پر جتھے ہوئے تھے، دوسری طرف آپ اپنی دعوت کی اور اپنے حامیوں کی حفاظت کے لیے کئی معاشرے کے اجتماعی نظام کو بھی استعمال کرتے تھے اور اس کے خیر کے پہلوؤں کی قدر کرتے تھے۔

## عہد مدنی

ہجرت کا واقعہ غیر معمولی حد تک اہم اور سبق آموز ہے، اگرچہ آپ سے ابتداء نبوت میں ہی اس بات کا واضح خدائی وعدہ کر لیا گیا تھا کہ آپ کو اپنے مخالفوں پر واضح برتری حاصل ہوگی، اور آپ کا نبوی مشن مکمل ہو کر رہے گا، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان ساری احتیاطوں کا اور اپنی حد تک ان سارے وسائل کے اختیار کرنے کا حکم دیا جن سے اس عالم اسباب میں مخالفتوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے، اور خطروں سے بچا جاتا ہے۔ ہجرت کے موقع پر اگرچہ یہ یقین ہے کہ ”ان اللہ معنا“ اللہ ہمارے ساتھ ہے، اور اس کا آپ حضرت ابوبکرؓ کو اطمینان بھی دلاتے ہیں کہ ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، مگر اس کے باوجود آپ چھپتے بھی ہیں اور بھاگتے بھی ہیں، اور ساری احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں۔

سیرت نبوی کے تجزیاتی مطالعے میں یہ بات بھی غور و طلب ہے کہ مدینہ اور اہل مدینہ میں وہ کون سی خاص بات تھی جو اس کے خداوندی انتخاب کا سبب بنی؟ یہ جتھو مدینہ کی نسبت کافی محفوظ جغرافیائی پوزیشن (۱)، آپ کا مدینہ میں نانیہالی رشتہ (۲)، مدینہ کے عرب قبائل کا سادہ و نرم مزاج اور خونے وفا، جیسے اسباب تک پہنچائے گی۔ اس کے علاوہ ایک تاریخی سبب بھی سامنے آتا ہے جس کی طرف امت کی ذہین ترین خاتون ام المومنین حضرت عائشہ کی عقل رسا پہنچی ہے۔ اوس و خزرج کے درمیان کئی دہائیوں سے جنگوں کا جو طویل سلسلہ چلا آتا تھا، اس نے ان کو کسی نجات دہندہ کے استقبال کے لیے ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا، وہ نجات دہندہ اسلام ثابت ہوا (صحیح بخاری)۔

مدینہ منورہ میں منافقین کے مسئلہ سے کس طرح نمٹا گیا، نیز منافقین اور ان کے طریقہ واردات کا مطالعہ بھی ایک اہم موضوع ہے۔

رسول اللہ جب مدینہ منورہ پہنچے تھے تو مہاجرین کی حیثیت ایک کمزور پناہ گزین گروہ کی تھی، انصار کبھی کوئی بڑی طاقت نہیں تھے، مدینہ میں مشرک خاندانوں کے علاوہ یہودیوں کی ایک بڑی طاقت بھی تھی جو الگ الگ قبائل میں

منقسم اور اپنا دفاعی نظام رکھتے تھے، سارا عرب قریش کا پیرو اور ان کی مذہبی قیادت کا معترف تھا، آپ نے مدینہ پہنچ کر ایک کثیر معاشرتی اور مختلف سماجی اور فوجی طاقتوں پر مشتمل ایک ریاست کی تشکیل کی، جس میں مذہبی گروہوں اور قبائلی اکائیوں کے درمیان باہمی اعتماد، آزادی اور مساوات پر مبنی تعاون و دفاع کا نظام قائم ہوا، پھر اطراف کے مشرک قبائل سے دفاعی معاہدے کیے گئے، جس میں کچھ نے حمایت کے معاہدے کیے، کچھ نے اطلاع رسانی کے، اور کچھ نے کسی حملے کی صورت میں غیر جانبدار رہنے کے۔ آپ نے مدینہ پہنچنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال انہی مہموں میں اور ان مقاصد کی تک و دو میں بسر کیا، اس سلسلے میں غزوہ بدر سے پہلے کے سرایا اور مہمات کے مقاصد کی کھوج اور ان کی دریافت نہایت ضروری کام ہے، پتہ چلانا چاہیے کہ ان میں کیا مقاصد حاصل کیے گئے۔

یہ دور بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس میں کمزور مسلم ممالک کے لیے نبوی حکمت عملی کی روشنی ہے۔ غزوات نبوی کے اسباب اور پس منظر سے متعلق مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسلام کے عادلانہ قوانین کی روشنی میں اور صحیح روایات کی روشنی میں ان کا مطالعہ کیا جانا چاہیے، مدینہ میں جو اسلامی ریاست قائم ہوئی اس کی تنظیمات، شعبہ جات، اور طریق کار سے متعلق کام ابھی عام نہیں ہوئے ہیں، معاصر مورخین نے اس طرف توجہ کی ہے، ضرورت عمومی مطالعے کی ہے۔

سیرت نبوی کا ایک نہایت اہم موضوع وہ اخلاقی اور روحانی انقلاب ہے جو آپ کے ذریعہ دنیا میں آیا، جس کے بارہ میں ہر واقف کار دوست و دشمن کی شہادت ہے کہ دنیا میں کبھی اس سے زیادہ روح پرور بہار اخلاق و ایمان نہیں آئی۔ سچی خدا پرستی، عدل و انصاف، اور انسانوں کی محبت و نفع رسانی میں اس نسل کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کو محمد رسول اللہ نے تیار کیا تھا۔ یہ سیرت محمدی کا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے بڑا معجزہ ہے۔

### حواشی:

- ۱۔ مدینہ کے مشرق و مغرب کی جانب ”حرے“، یعنی ناقابل عبور نوکیلے پتھر تھے، جنوبی طرف گھنے نخلستان، شمال مغرب میں ”سلع“ نامی پہاڑی اور شمال میں احد کا پہاڑ، اس طرح مدینہ تقریباً ۳ چوتھائی گھرا ہوا تھا۔
- ۲۔ عربوں میں بھانجے اور نواسے کا رشتہ بڑی حمیت اور غیرت کا ہوتا تھا، بسا اوقات کوئی مظلوم اپنے نانبہالی رشتہ داروں کی مدد سے ہی خطروں کا مقابلہ کرتا تھا، ان کی قبائلی غیرت کے لیے یہ رشتہ اتنا حساس ہوتا تھا کہ وہ عام طور پر اپنا جان مال قربان کر کے بھی اس رشتہ کا پاس رکھتے تھے۔